صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد طاب ثراہ

جناب یوسف سرسوی صاحب، لکھنؤ

جسم پہ دھانی قبا، دوش پہ سیاہ عبا، سر پر سیاہ عمامہ، آنکھوں میں چمک، ماتھے پہ دَمک، نورانی چہرہ سے جلالتِ علمی و وجاہت خاندانی آشکار، صاف ظاہر، پاک باطن، بلند کردار، خوش اطوار، شفیق و مہربان، پیکر خلوص و محبت، با مروّت و باحمیّت، زندہ دل، شگفتہ مزاج، گوہر نایاب شرافت، تاجدارِ اقلیم خطابت، خزینہ علم و حکمت آقائے شریعت صفوۃ العلماء جناب مولانا سید کلب عابد طاب ثراہ کی ذات والا صفات لکھنؤ کی جان تھی۔ جب وہ خوش خرام و سبک رَو عالمِ باعمل و قائد بے بدل جوہری محلہ کی تنگ گلی سے برآمد ہوتا تھا تو لوگ باادب ہوجاتے تھے۔ ان کی ذات نسیم صبح کے مانند تھی وہ اک چراغ تھے۔ جس کی روشنی سے شبستانِ لکھنؤ جگمگا رہا تھا۔ نرم و دل کش لہجہ، تیز و پراثر نگاہ، سنجیدہ گفتگو، پُرلطف باتیں۔ ان کی شخصیت میں بے پناہ جاذبیت و کشش تھی۔ دل کھینچتے تھے اور ان کے حضور آنکھیں احتراماً جھک جاتی تھیں۔ کیسی محبوب کیسی پیاری اور کیسی پُروقار شخصیت، کیسی بلند و ہردلعزیز ہستی... وہ اخلاق و آداب کی جیتی جاگتی تصویر تہذیب و شائستگی کا منھ بولتا مرقع تھے۔ قوم کا دل، ملّت کا دماغ تھے۔ آدمی سب ہیں، انسان ہونا بڑی بات ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف النفس انسان تھے۔ تلخ کلمہ ان کی زبان پر آتا ہی نہ تھا۔ بڑے سے بڑا دباؤ یا لالچ انہیں ان کے موقف سے نہ ہٹا سکتا تھا وہ سیّد و سردار تھے ہر آزمائش کی گھڑی میں انہیں آگے پایا۔ کشیدگی اور تناؤ کے ماحول میں بھی وہی اطمینان وہی سکون وہی پامردی وہی استقامت۔ نہ خوف نہ ہراس۔ مرد تھے بہادر تھے مزاج میں سادگی رچی بسی تھی ان کی ذات تکلّف سے بری تھی مُسکرا مُسکرا کر باتیں کرتے تھے۔ گھر سے مسجد آصفی تک اور پھر مسجد آصفی سے گھر تک پیدل تشریف لے جاتے تھے۔ وعدے کی سختی سے پابندی کرتے تھے، اگر کسی سے وعدہ کرلیا تو پورا کرتے تھے۔ قوم کو ان پر مکمل اعتماد تھا اور انہیں اپنی قوم پر پورا بھروسہ۔ جو وہ کہتے تھے بس وہی ہوتا تھا پوری شیعہ قوم ان کے اشاروں پر چلتی تھی اور وہ ہمیشہ قوم کے سینہ سپر رہتے تھے۔ جناب نے کہا ہے۔ جناب نے کہا ہے ہر شخص ان کے حکم پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا بڑے سے بڑے مجمع پر قابو پالیتے تھے ہاتھ سے اشارہ فرمایا اور بڑھتا ہوا مجمع رُکا۔ اشارہ فرمایا اور مجمع بڑھا، ایسے ہوتے ہیں رہنما اور اسے کہتے ہیں رہبر۔ زندگی بھر افراد قوم و دیگر اداروں کی مدد و اعانت فرماتے رہے ان کے بعد شیعوں میں ان جیسا رہنما نہیں ہے۔

وہ خاندان غفرانمآبؒ کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا سلسلۂ

نسب سید نصیر الدین سبزواری کے توسط سے امام وہم حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے۔ وہ ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ سلطان المدارس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد نجف اشرف تشریف لے گئے اور درجۂ اجتہاد پر فائز ہوئے انہوں نے سید محسن حکیم، سید جواد تبریزی، علامہ ضیاء الدین اور سید ابن حسن نونہروی جیسے جیدّ علماء سے علم حاصل کیا اور ان کے نام کو روشن کیا۔ بائیس برس تک سلطان المدارس میں درس دیا پھر آٹھ برس تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شیعہ شعبۂ دینیات کے ڈین رہے، انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ ر برس تھی۔

ہندوستان میں شیعوں کا سب سے بڑا مرکز لکھنؤ ہے اور لکھنؤ میں سب سے پہلے شیعیت کا پرچم لہرانے والے سید دلدار علی غفرانمآب طاب ثراہ ہیں۔ اس خطۂ ارض میں شیعیت کے فروغ کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ ان کے خاندان میں یکے بعد دیگرے علمائے دین ہوتے چلے آئے ہیں اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ اس خاندان میں اتنے مجتہدین ہوئے کہ نام ہی خاندان اجتہاد پڑ گیا۔ یہ خاندان پچھلے دوسو برس سے نشر و اشاعت علوم محمدؐ وآل محمدؐ میں لگا ہوا ہے۔ اس خاندان کے علماء نے اگر ایک طرف میدان خطابت میں اپنا سکہ جمایا تو دوسری طرف تیغ قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ تصانیف و تالیفات کے ڈھیر لگا دیئے۔ بفضلِ خدا محراب و منبر اس خاندان کی میراث بن گئے ہیں اور اس کے فیوض و برکات سب پر آشکار ہیں۔

وہ ایک مستند عالم اور معتبر ذاکر تھے۔ ان کے جوہر منبر پر کھلے، میں نے ان کی تین سو سے زیادہ مجلسیں سنیں۔ ان کی فصاحت و بلاغت کا کیا کہنا۔ الفاظ و معانی کے پھول کھلاتے چلے جاتے تھے۔ پوری مجلس ایک لہجے میں پڑھتے تھے۔ اردو سبھی بولتے ہیں مگر میں نے کسی کو ایسی پاک وصاف سلیس و شستہ اردو بولتے نہیں سنا۔ کوئی لفظ یا جملہ بے محل استعمال نہ فرماتے تھے۔ مجلس پڑھتے وقت آواز کا اتار چڑھاؤ تاثر کو دو چند کر دیتا تھا۔ میں نے ان کی زبان مبارک سے پہلا عشرہ محرم ۱۹۵۳ء میں سنا تھا وہ اس وقت نجف اشرف سے واپس ہوئے تھے اور غالباً پہلا عشرہ محرم سرسی میں ''دالان'' کے امام باڑہ میں پڑھا تھا۔

ان کی آخری مجلس بھی ۶ دسمبر ۱۹۸۶ء کو سرسی ہی میں سنی۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۶ء تک تئیس برس تک امام باڑہ غفرانمآبؒ میں عشرہ محرم پڑھے۔ کیا کیا مجلسیں۔ حصول ثواب دارین کے علاوہ ان کی مجالس حصول علم کا ذریعہ تھیں، سنئے اور دامن علمی موتیوں سے بھرتے رہئے۔

انہوں نے پچھلے تیس پینتیس برس میں اتنی مجلسیں پڑھیں کہ برصغیر ہندو پاک ان کی آواز سے گونجنے لگا۔ ہر سال مجلس شام غریباں اپنے مخصوص انداز میں اس شان سے پڑھتے تھے کہ مجمع پر کیف طاری ہو جاتا تھا امام باڑہ غفرانمآبؒ کا وسیع صحن اداس شام، نہ فرش نہ روشنی اور منبر پر ذاکر شام غریباں، کیا سماں ہوتا تھا وہ مجلس پڑھتے تھے اور سارا عالم گوش برآواز ہوتا تھا۔ عمر بھر منبروں سے خزانہ علوم لٹاتے رہے۔ اپنی گونا گوں مصروفیت کے باوجود مختلف رسائل میں مضامین بھی لکھتے رہتے

تھے۔ ان کی مجالس کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

مجلس میں، نماز میں یا پھر سرراہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ گھر سے کٹرہ ابوتراب خاں اور وہاں سے گھر پیدل ہی تشریف لے جاتے تھے۔ صاحب سلامت میں ہمیشہ سبقت فرماتے تھے میں شعوری طور پر تیار رہتا تھا اور ملتے ہی ان کی خدمت میں سلام عرض کرتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جناب کا ہاتھ پہلے اُٹھ جائے۔ اور مجھے شرمندہ ہونا پڑے باوضع انسان تھے۔ جب ملاقات ہوتی حال پوچھتے' مولوی صاحب کیسے ہیں' والد ماجد کا انتقال ہوا۔ تعزیت کے لیے میرے گھر تشریف لائے۔ ایک گھنٹہ قیام فرمایا، معلوم ہوا کوئی سرپرست آیا ہے، عزیز قریب آیا ہے، کیسی محبت کیسا خلوص کیسی ہمدردی ان کے الفاظِ تسلی ان کی باتیں دل پر نقش ہیں۔

عمر میں ایک بار سہی مجھے ان کی خدمت کا شرف ملا۔ ان کی خاطر تواضع کی سعادت نصیب ہوئی۔ انہیں ۶ ردسمبر ۱۹۸۶ء کو سرسی میں والد ماجد کے ایصال ثواب کی مجلس پڑھنی تھی۔ کسی مُفسد نے خبر اڑادی کہ مرادآباد میں کرفیو لگا ہے شہر میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ میں جناب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا آپ چلئے میں اسٹیشن پہنچ رہا ہوں وہ گاڑی آنے کے وقت سے بہت پہلے اسٹیشن پہنچ گئے۔ نوچندی ایکسپریس ذرا تاخیر سے آئی اور رزویشن کا ڈبہ گاڑی کے آخر میں لگا۔ میرے ساتھ اہل وعیال تھے کافی اسباب تھا۔ میں نے اپنا سامان قلی کو دیا اور خود جناب مرحوم کا سامان اٹھا کر چلنے لگا۔ مختصر سا بستر بند ایک چھوٹی سی کنڈیا جس میں تھرمس اور لوٹا، ارے آپ یہ کیا کررہے ہیں کنڈیا مجھے دے دیجئے۔'' بھلا میں اس سعادت کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتا۔ گاڑی علی الصبح مرادآباد پہنچی۔ اسٹیشن سے ہم لوگ مسلم مسافرخانہ گئے۔ میں چائے لایا۔ کیوں زحمت کی میرے تھرمس میں چائے ہے۔'' میں نے تھرمس کی چائے بطور تبرک تقسیم کی تو مسکرانے لگے، مرادآباد بس اسٹیشن پر انہوں نے ایک اخبار خرید فرمایا۔ آئینہ عالم' لیجئے دیکھئے۔ میں نے کہا کیا دیکھوں آئینہ عالم' یا آئینہ عالم' فرمایا صورت عالم، سیرت عالم میری زبان سے بے اختیار سبحان اللہ نکلا۔ سرسی میں فلسفہ کے موضوع پر مجلس پڑھی۔ یادگار مجلس! نماز ظہرین پڑھائی۔ نماز عصر کے سجدہ آخر کو قدرے طول دیا میں اس وقت نہ سمجھا کہ وہ سرسی میں آخری بار نماز ادا فرمارہے ہیں۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ دو مجلسیں اور پڑھ دیجئے۔ فرمایا خرد صاحب کی مجلس پڑھنی ہے پھر فتح پور جانا ہے، مجھ سے کوئی طاقت کہہ رہی تھی کہ جناب کو جانے نہ دو روک لو میں نے کہا کوئی اور پڑھ دے گا۔ فرمایا وعدہ وعدہ ہے، کاش! میں انہیں روک لیتا۔

حج و زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو مشہد مقدس میں خواب دیکھا کہ امام علی رضا علیہ السلام نے انگشتری عنایت فرمائی ہے۔ قم پہنچے تو آقائے پایئگانی نے وہی انگوٹھی جسے خواب میں دیکھا تھا انہیں سچ مچ عطا فرمائی۔ یہ بارگاہ امامؑ میں ان کا رتبہ ان کی منزلت، جاڑوں کی رات تھی۔ کوئی حاجت مند ان کے در تک پہنچنا چاہتا تھا نہ پہنچ سکا راستے میں بے ہوش ہو کر گرا اور سردی میں ٹھٹھر کر مرگیا' رات بھر اس کی لاش سرراہ پڑی رہی۔ صبح جب جناب کو اس کا علم ہوا تو سخت صدمہ، بڑا قلق ہوا۔ فرمایا افسوس میں اس کی مدد نہ کر سکا زندگی بھر اس کی موت کا داغ رہے گا۔ خود عالم غربت و مسافرت کی موت پسند

فرمائی سرد و تاریک رات، جنگل کا سناٹا، تنہائی، بے کسی و بے بسی، زخمی ذاکر حسینؑ ہائے ان پر کیا گذری ہوگی......۔

ایسی زندگی کسے ملتی ہے اور ایسی موت کسے نصیب ہوتی ہے۔ جب تک جیئے سربلند رہے اور دنیا سے اُٹھے تو سرخرو اُٹھے۔ مجلس پڑھ کر آرہے تھے مجلس پڑھنے جارہے تھے راہِ مولا میں شہید ہوگئے۔ مرتے مرتے شہیدان کربلا کی یاد تازہ کر گئے، جب ان کی موت کی خبر لکھنؤ پہنچی تو شہر میں کہرام برپا ہوگیا دلوں پر غم والم کے بادل چھا گئے ہر طرف سوگوار، ہر سمت غم گسار، سب مغموم، سب ملول۔

عزت وشرف بخشنے والا صرف خدا ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت۔ انہیں جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، جو عزّت و توقیر ملی وہ کم لوگوں کے حصّے میں آتی ہے ان کا جنازہ جس شان سے اٹھا ان سے پہلے لکھنؤ میں کسی کا نہ اُٹھا تھا۔ پانچ لاکھ سوگواروں کا مجمع، جنازہ کے ساتھ سرہی سر تھے۔ جنازہ کے آگے آگے علم تھے، قرآن پاک کی تلاوت ہورہی تھی، سب کے لبوں پر کلمہ توحید و نعرہ حیدری تھا۔ ہزاروں غمزدہ لوگ امام باڑہ آصفی سے حسینۂ غفرانمآبؒ تک سڑک کے دونوں طرف قطار در قطار تعظیماً کھڑے تھے۔ عورتیں آہ بکا کر رہی تھیں۔

رات بھر میّت آصفی امام باڑہ میں رکھی رہی۔ صبح جنازہ اٹھا۔ راہ میں ٹیلے والی مسجد کے قریب جنازہ رکا۔ چالیس علم مبارک، جناب مرحوم کا جنازہ اور ٹیلے والی مسجد کا سبزہ زار۔ شیعہ سنّی دونوں نے مل کر دوسری بار نماز جنازہ پڑھی مل کر ان کا جنازہ اٹھایا ہر مکتبۂ فکر و خیال کے لوگ تمام فرقوں کے افراد ان کے جنازہ کے ساتھ تھے۔

جناب عباسؑ کا علم اور پیر شاہ محمد کا ٹیلہ۔ یقیناً یہ اعجاز مولاؑ تھا۔ غالباً لکھنؤ کی تاریخ میں پہلی بار علم وہاں گیا۔ اُس دن سنّی حضرات نے جس فراخدلی اور رواداری کا مظاہرہ کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ امام باڑہ غفرانمآبؒ تک شیعوں کے دوش بدوش شریک رہے۔

دفن کے وقت یہ عالم تھا کہ جوش غم و فرطِ عقیدت میں لوگ قبر میں گرے پڑ رہے تھے۔ اہل الہ آباد و اہل جائس و نصیر آباد بڑی تعداد میں میت کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے۔ انتظام کر رہے تھے مجمع کو سنبھال رہے تھے۔ وہ سب مہمان تھے انہوں نے بڑا کام کیا، اہل لکھنؤ کیا پوری قوم ان کی شکر گزار ہے۔ ملک کے اخبار و رسائل نیز دیگر ذرائع ابلاغ نے ان کے غم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مرکزی وزرا تک تعزیت کے لیے آئے۔

مولانا مرحوم کی ساری زندگی خدمت دین وملت میں بسر ہوئی وہ بابری مسجد کا قضیہ ہو یا یکساں سول کوڈ کی بات، پرسنل لا کا معاملہ ہو یا بنارس میں قبور کے انہدام کا مسئلہ۔ ہر امر میں ان کی قیادت مسلّم تھی۔ اپنی بے مثال جرأت مندی، حق گوئی و بے باکی سے انہوں نے ملت اسلامیہ کا دل جیت لیا۔ سب کے محبوب بن گئے وہ اتحاد بین المسلمین کے خواہاں تھے۔ مر کے سب کو ایک کر گئے پوری امّت مسلمہ ان کے غم میں سوگوار ہے غیر مسلموں تک کو ان کے مرنے کا غم ہے۔ وہ سیاسی رہنما نہیں تھے لیکن بلند نظر و باخبر انسان تھے ہندوستان اور پوری ہندوستانی قوم سے محبت کرتے تھے۔ اپنے ملک وقوم کی ترقی و خوشحالی کے متمنی تھے اور اس کے لیے اپنے طور پر کوشاں تھے....۔

